Al-Misbah, **Vol. 2 No. 3**(2022),144-156
https://almisbah.info/

Research Journal
AL-MISBAH

قوم یہود اور ریاست اسرائیل کا قیام: تاریخی پس منظر

The Jewish Nation and the Establishment of the State of Israel: Historical Background

*Dr.Nighat Akram
**Rizwana Kouser

ABSTRACT

The few lines of the Torah in which the Lord promised Abraham that he would give this land to his descendants serve as the foundation for their claim to the region of Palestine. They identify themselves as descended from their forefathers and assert that God had told them that He would only grant them the right to this land. Although the Jews have long claimed to be the rightful proprietors of Palestine, they have only really had control over it for a short period—about a hundred years. Jews have been ruled over by other countries on this territory for many years, and even now, if their government is still in place, it is because of backing and assistance from other countries. But despite these historical realities, Jews attempted numerous theoretical and actual attempts to overthrow the Muslim administration in Palestine and establish Jewish control in this area. This essay looks at how Jews related to this area historically, established their control and made it the core of their aspirations.

Keywords: Occupied Palestine, Jewish land, Israel, Arab & Israelites, Torah

خطہ عرب

فلسطین کا علاقہ مغربی ایشیا اور جزیرہ نما عرب میں واقع ہے جس کی سرحدیں ملک شام کی حدود سے جا ملتی ہیں۔ عرب کے مشرق میں بحر ہند و فرات جب کہ مغربی طرف میں بحیرہ احمر ہے۔ اس خطے کا اکثر حصہ ریگستانی اور غیر آباد رقبے پر مشتمل ہے۔[1] مختلف مؤرخین نے سرزمین عرب کا حدود و اربعہ کچھ یوں بیان کیا ہے کہ

"شمال یا مغرب سے جنوب مشرق تک اس کی زیادہ سے زیادہ لمبائی ۱۸۰۰ میل اور چوڑائی چھ سو میل ہے۔"[2]

* Assistant Professor, Department of Islamic Studies, University of Poonch, Rawalakot, AJK.
** Lecturer, Department of Islamic Studies, University of Azad Jammu & Kashmir, Muzaffarabad.

ISSN-Online: 2790-8828
ISSN-Print: 2790-881X

سید سلیمان ندوی نے عرب کی حدود و قیود بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"جنس اور جغرافیائی حدود کے اعتبار سے یہ سارا علاقہ عرب کا علاقہ تھا اور اس کے بسنے والے عرب تھے۔"[۳]

عرب کا خطہ اس وقت آباد ہوا جب طوفان نوحؑ کے بعد حضرت نوحؑ کے بیٹے سام کی اولادیں یہاں آباد ہوئیں اور بعد ازاں یہ جزیرہ عرب نسل انسانی کا سب سے بڑا مسکن بن گیا حتی کہ مشرقی وسطی میں آباد ہونے والے سامی قبائل بھی یہیں سے ہجرت کر کے وہاں آباد ہوئے۔ بابلیوں، اشوریوں، عبرانیوں، قینقیوں، آرامیوں اور حبشیوں پر مشتمل یہ سامی اقوام بنیادی طور پر ایک ہی جڑ سے ہیں جو بعد میں رفتہ رفتہ مختلف مقامات پر منتشر ہوتی گئیں۔[۴] اس ضمن میں احمد حسن زیارت لکھتے ہیں کہ

"فسکن البابلیون والاشوریون العراق، والقینقیون سواحل سوریه، والعبرانیون فلسطین والاحباس والحبشیه"[۵]

"بابلیوں اور اشوریوں نے عراق میں سکونت اختیار کی، قینقیوں نے شام کا ساحلی علاقہ آباد کیا، عبرانیوں نے فلسطین اور حبشیوں نے حبشہ کا علاقہ آباد کیا۔"

بنی اسرائیل

اسرائیل یہودیوں کے جدِ اعلیٰ حضرت یعقوبؑ سے منسوب عبرانی لفظ ہے جو اسراً (عبد) اور ایل (اللہ) دو الفاظ کا مرکب ہے جس کا مطلب ہے عبداللہ۔ حضرت یعقوبؑ سیدنا ابراہیمؑ کے پوتے اور سیدنا اسحاقؑ کے بیٹے تھے لہذا ان کی تمام آل اولاد بنی اسرائیل کہلاتی ہے۔[۶] بائبل کے مطابق اسرائیل حضرت یعقوبؑ کا لقب تھا جو انہیں اس وقت عطا کیا گیا جب انہوں نے ساری رات ایک فرشتے سے زور آزمائی کی اور بعد ازاں اس پر غالب آ گئے۔[۷] اس فتح کے بعد انہیں خداوند کی طرف سے اسرائیل کے لقب سے ملقب کیا گیا ہے۔ بائبل کی طرح قرآن مجید بھی سیدنا یعقوبؑ کو اسی نام سے موسوم کرتا ہے تاہم بائبل کے برعکس قرآن میں حضرت یعقوبؑ کے لیے یہ نام صرف ایک جگہ وارد ہوا ہے۔

"كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيٓ اِسۡرَآءِيۡلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسۡرَآءِيۡلُ عَلٰى نَفۡسِهٖ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تُنَزَّلَ التَّوۡرٰىةُ"[۸]

"بنی اسرائیل کے لیے تورات کے نزول سے پہلے کھانے کی تمام چیزیں حلال تھیں بجز ان کے جو اسرائیل نے خود اپنے اوپر حرام کر لی تھیں۔"

اس مقام کے علاوہ ہر بار آپؑ کو یعقوب کے نام سے ہی پکارا گیا ہے البتہ اولادِ یعقوب کا تذکرہ بار بار بنی اسرائیل کے لقب سے ہوا ہے۔ ورلڈ بک انسائیکلوپیڈیا میں لفظ اسرائیل کے ذیل میں کچھ اس طرح مرقوم ہے کہ

"Jews are the descendants of an ancient people called the Hebrew. During Biblical times, the Hebrews who came to be called Israelites-lived in what is now Israel."[9]

"یہودی ان قدیم لوگوں کے اخلاف ہیں جنہیں عبرانی کہا جاتا ہے۔ بائبلی عہد میں عبرانیوں کو اسرائیلی کہا جانے لگا اور پھر یہ اسرائیل ہو گئے۔"

تاریخی پس منظر

طوفان نوحؑ کے بعد دنیا کی آباد کاری ان اہل ایمان سے ہوئی جو اس عظیم طوفان کے بعد پیغمبر وقتؑ کے ہمراہ ہونے کے سبب سے بچ گئے تھے۔ بعد ازاں یہی لوگ بالعموم اور بالخصوص سیدنا نوحؑ کی آل اولاد مختلف بر اعظموں میں پھیل گئی اور مختلف طرز زندگی اور پیشے اختیار کر لیے۔ شام و فرات کے مابین رہنے والے اکثر لوگوں نے گلہ بانی کو بطور پیشہ اختیار کیا بدویانہ طرز زندگی گزارنے لگے۔[10] شام و فرات کے مابین اسی خطے میں سیدنا ابراہیمؑ پیدا ہوئے جنہوں نے ملک شام کی جانب ہجرت کی۔ حضرت ابراہیمؑ سامی النسل تھے اور آپ کا شجرہ مبارک کچھ اس طرح سے ہے۔

"ابراہیم (خلیل اللہ) بن تارح بن ناحور بن ساروغ، بن ارغوا، بن فالغ، بن عابر، بن شالخ بن قینان، بن ارفخشذ، بن سام، بن نوع علیہ السّلام"[11]

حضرت ابراہیمؑ ملک عراق میں دریائے دجلہ و فرات کے سنگم پر واقع ایک قصبہ "ار" کے باشندہ اور اہلِ فدان میں سے تھے۔ آپؑ کی قوم بت پرست تھی مگر آپ کا دل و دماغ ان خود تراشیدہ معبودوں کی جانب مائل نہ ہو سکا۔ چنانچہ انہوں نے بت پرستی کی نفی کر دی اور تلاشِ حق کے لیے سر گرداں ہو گئے اور حق واضح ہو جانے کے بعد آپ نے سب سے پہلے اپنے والد کو راہِ مستقیم دکھائی اس کا ذکر قرآن حکیم میں آیا ہے۔ فرمایا:

"اِذْ قَالَ لِاَبِیْهِ وَقَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِیْلُ الَّتِیْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ"[12]

"جب انہوں نے اپنے باپ اور اس کی قوم سے کہا کہ یہ کیا مورتیں ہیں جن کی پرستش پر تم معتکف ہو۔"

اس کے بعد حضرت ابراہیمؑ کے نے اپنے علاقے کی عوام و جمہور کے سامنے اپنی دعوت و پیغام عام کیا مگر قوم نے آپ کے پیغام کو سختی سے رد کر دیا۔

"اِذْ قَالَ لِاَبِیْهِ وَقَوْمِهٖ مَا تَعْبُدُوْنَ قَالُوْا نَعْبُدُ اَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عٰكِفِیْنَ"[13]

"جب انہوں نے اپنے باپ اور ان کی قوم کے لوگوں سے کہا کہ تم کس چیز کو پوجتے ہو تو وہ کہنے لگے کہ ہم بتوں کو پوجتے ہیں اور ان کی (پوجا) پر قائم ہیں۔"

حضرت ابراہیمؑ چوں کہ اس شرک اور بت پرستی سے علی الاعلان بے زار تھے لہذا ایک دن موقع پا کر انہوں نے اپنی قوم کے بتوں کو پاش پاش کر ڈالا اور پھر بادشاہ کے استفسار کرنے پر یہ جواب دیا کہ خود ان بتوں سے پوچھ لو کہ یہ کام کس نے کیا ہے؟ اس پر وہ سب لوگ مبہوت ہو گئے اور بادشاہ اس قدر زچ ہوا کہ اس نے فیصلہ کیا کہ حضرت ابراہیمؑ کے بھڑکتی ہوئی آگ میں ڈال دیا جائے۔ تاہم جب انہیں آگ میں پھینکا گیا تو اللہ کے حکم سے آگ ان کے لیے گل و گلزار بن گئے۔ اس واقعے کو قرآن مجید نے اس طرح سے بیان کیا ہے کہ

"قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ"[۱۴]

"ہم نے حکم دیا کہ اے آگ سرد ہو جا اور ابراہیم پر موجب سلامتی بن جا۔"

اس واقعے کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو حکم دیا کہ وہ اس علاقے سے ہجرت کر کے فلسطین تشریف لے جائیں چنانچہ حضرت ابراہیمؑ نے حکم خداوندی پر اپنے باپ داد اکا علاقہ چھوڑا اور فلسطین آ کر آباد ہو گئے۔ تورات کے مطابق اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ سے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ اس علاقے سے ہجرت کریں گے تو خداوند انہیں ایک دوسرا علاقہ عطا فرمائے گا۔ تورات میں اس وعدے کا ذکر کچھ اس طرح سے ہے۔

"اور خداوند نے ابراہیم سے کہا کہ تو اپنے وطن اور اپنے ناتے داروں کے بیچ سے نکل اور اپنے باپ کے گھر سے نکل کر اس ملک میں جا جو میں تجھ کو دوں گا۔"[۱۵]

چنانچہ اس حکم خداوندی کی تعمیل میں آپؑ اپنی بیوی سارہ اور بھتیجے لوط کے ہمراہ ملک شام تشریف لے گئے جہاں سے تبلیغ کرتے ہوئے فلسطین کے غربی اطراف میں جا کر مستقل سکونت اختیار کر لی۔ قصص القرآن کے مطابق اس وقت یہ علاقہ کنعانیوں کے زیر اقتدار تھا۔ جیسا کہ مولانا حفیظ الرحمن لکھتے ہیں کہ

"جب وہ اپنے گلہ کو لے کر اس علاقہ سے گزر رہے تھے جس کا نام کنعان تھا اور جسے بعد میں فلسطین کہا گیا تو ان کے خدا نے ان سے وعدہ کیا کہ وہ کنعان کا زرخیز علاقہ کا حاکم انہیں اور ان کے قبیلے کے افراد کو بنا دے گا۔"[۱۶]

توریت میں اسی بابت کہا گیا ہے کہ

"اس وقت ملک میں کنعانی رہتے تھے تب خداوند نے ابراہیم کو دکھائی دے کر کہا کہ یہی ملک میں تیری نسل کو دوں گا۔"[۱۷]

حضرت ابراہیمؑ کی اولاد میں سے آپ کے بیٹے اسحاق اور پھر ان کے بیٹے یعقوب کا قیام یہیں رہا، یعقوبؑ کا لقب اسرائیل کہلایا جس کے باعث آپ کی قوم کو بنی اسرائیل کا لقب مل گیا۔ اسی نسبت کی بنا پر تمام عبرانی جو حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد سے نہ تھے بنی اسرائیل کہلائے۔[۱۸]

بعد میں حضرت یعقوبؑ نے ملک شام کی جانب ہجرت فرمائی تھی توریت کے مطابق آپ کو اپنے بھائی کی جانب سے جان کا خطرہ لاحق ہو گیا تھا جس کے باعث آپ کی والدہ نے آپ کو ملک شام کی جانب ہجرت پر مجبور کر دیا تھا۔

"اس نے اپنے چھوٹے بیٹے کو بلا کر کہا کہ تیرا بھائی عیسو تجھے مار ڈالنے پر ہے اور یہی سوچ سوچ کر اپنے کو تسلی دے رہا ہے۔ سوائے میرے بیٹے تو میری بات سن اور اٹھ کر حاران کو میرے بھائی لابن کے پاس بھاگ جا۔"[۱۹]

توریت کے مطابق حضرت یعقوبؑ نے اپنی ماں کا کہنا مان لیا اور حاران روانہ ہو گئے اور مستقل طور پر یہیں سکونت پذیر ہو گئے۔[۲۰]

آپؑ کی اولاد نے بھی اپنے باپ کے ساتھ کنعان کو ہی اپنا مستقل مسکن بنا لیا تا دم کہ آپ کے فرزند حضرت یوسفؑ کو ان کے دوسرے بھائیوں نے کنویں میں پھینک دیا جہاں سے حضرت یوسفؑ مصر کے ایک قافلہ کے ہاتھ آ گئے جنہوں نے آپ کو عزیزِ مصر کے ہاتھ فروخت کر دیا یوں گردش حالات اور امتدادِ زمانہ کے ہاتھوں خاندانِ یعقوب کا ایک فرد مصر جا پہنچا اور گزرتے وقت کے ساتھ مصر کی حکومت کے ایک اہم منصب پر فائز ہو گیا۔ اسی زمانہ میں شام و مصر میں قحط پڑ گیا تو برادران یوسفؑ بھی حصول غلہ کی خاطر مصر پہنچے جہاں حضرت یوسفؑ نے کمال حکمت عملی سے خود کو ان پر ظاہر کر کے ان کے جرم کو نہ صرف معاف کر دیا بلکہ اس پورے خاندان کو مصر بلوا لیا۔ اس حوالے سے بائبل میں مذکور ہے کہ

"حضرت یوسفؑ نے اپنے باپ اور بھائیوں کو بسا دیا اور فرعون کے حکم کے مطابق ریمسیس کا علاقہ جو ملک مصر کا نہایت زرخیز خطہ تھا ان کی جاگیر ٹھہرا۔"[۲۱]

حضرت یوسفؑ کے انتقال کے بعد بھی بنی اسرائیل مصر میں ہی سکونت پذیر رہے اور وہاں مختلف میدانوں میں خوب ترقی کی۔ تاریخی روایات کے مطابق حضرت یوسفؑ سے قبل مصر پر ہاکسوس خاندان کی حکومت تھے جنہیں چرواہے بھی کہا جاتا تھا۔[۲۲] یہ لوگ اصلاً عرب تھے۔ حضرت یوسفؑ کے بعد مصر میں قوم پرستی کی تحریک چلی تو مصری قوم پرستوں نے ہاکسوس خاندان کی حکومت ختم کر دی جس کے نتیجے میں ہاکسوس کے منظور نظر افراد بنی اسرائیل بھی مصری قوم پرستوں کی غلامی میں چلے گئے۔ چودھویں صدی قبل مسیح میں حضرت موسیٰؑ نے انہیں مصریوں کی غلامیوں سے نکالا اور فرعون کو بدترین ہزیمت سے دوچار کیا۔[۲۳] اس ضمن میں قرآن مجید کا بیانیہ ہے کہ

"فَأَتبَعَهُم فِرعَونُ بِجُنُودِهِ فَغَشِيَهُم مِّنَ اليَمِّ مَا غَشِيَهُم"[۲۴]

"پھر فرعون نے اپنے لشکر کے ساتھ ان کا تعاقب کیا تو دریا کی لہروں نے ان پر چڑھ کر ڈھانک دیا۔"

مصر سے نکلنے کے بعد بنی اسرائیل نے جیتی جاگتی آنکھوں سے بارہا معجزات دیکھے، فرعون اور اس کا لشکر ڈوبتے دیکھا، آسمان سے اترتا من و سلویٰ دیکھا مگر اس کے باوجود اس قوم کی سرکشی اور احسان فراموشی و نافرمانی کا عالم یہ تھا کہ جب حضرت موسیٰؑ نے انہیں بیت المقدس میں داخل ہونے کو کہا تو انہوں نے جواب دیا کہ وہاں خطرہ ہے لہذا ہم داخل نہیں ہوں گے کہنے لگے۔

"قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ"[۲۵]

"وہ بولے کہ اے موسیٰ جب تک وہ لوگ وہاں ہیں ہم کبھی وہاں نہیں جاسکتے (اگر لڑنا ہی ضرور ہے) تم اور تمہارے رب جاؤ اور لڑو ہم یہیں بیٹھے رہیں گے۔"

اپنے اس سرکش فعل کے باعث اس قوم نے خداوند کریم کو ناراض کر دیا چنانچہ بطور سزا چالیس سال تک وہ اسی میدان میں بھٹکتے رہے اور انہیں مستقل ٹھکانہ کہیں میسر نہ آسکا۔ چالیس سال تک بھٹکنے کے بعد جب وہ پوری نافرمان نسل صحرا میں ہی مر گئی تو نئی نسل میں ان کے انداز و اطوار کسی حد تک ختم ہو گئے تھے لہذا اس نئی پود نے حضرت یوشعؑ کی قیادت میں کنعانیوں کے خلاف جہاد کیا اور سرزمین فلسطین میں داخل ہو گئے۔ فلسطین میں سکونت کے بعد باقاعدہ ان کی سیاسی زندگی کا آغاز ہوا اور فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا۔ گیارہویں صدی قبل مسیح تک یہاں یہودیوں کی بادشاہی قائم ہو چکی تھی جو حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کے ماتحت دسویں صدی قبل مسیح میں وقار و رفعت کے اوج تک پہنچ گئی تھی۔ حضرت داؤدؑ نے یروشلم فتح کر کہ وہاں بیت المقدس کی بنیاد رکھی مگر اس کی تکمیل آپ کے جانشین حضرت سلیمانؑ کے عہد میں ہوئی۔ عہد سلیمانی میں فلسطین میں اعلی شان اسرائیلی ریاست کی بنیاد پڑ چکی تھی اس دور میں خوب تجارت و ترقی ہوئی آپ کے بعد یہ سلطنت اپنا وجود برقرار نہ رکھ سکی۔ حضرت سلیمانؑ کے جانشینوں کے دور میں ریاست کے شمالی علاقے کے بارہ قبائل میں سے دس قبائل نے مرکز سے روگردانی کرتے ہوئے سماریا کے نام سے ایک نئی ریاست قائم کر لی اور جنوب کے دو قبیلوں نے یہودہ کی ریاست قائم کی۔[۲۶]

باہمی تفرقہ کے علاوہ اس دور میں بنی اسرائیل فواحش، بدکاری، عیاشی و بدمعاشی میں بھی ڈوب گئے اور ایک بار پھر توحید سے منحرف ہو کر بت پرستی کی جانب پلٹ گئے، توریت میں ردّوبدل کر دیا گیا نیز دونوں حکومتیں ہمیشہ باہم دست و گریبان رہنے لگیں جس کے باعث زیادہ عرصہ اپنا وجود برقرار نہ رکھ سکیں۔ ان کی کمزوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ۷۲۲ ق م میں اشوریوں نے شمالی سلطنت پر قبضہ کر لیا اور ۵۸۶ قبل مسیح میں بابلیوں نے باقی ماندہ علاقے پر قبضہ کر کے پوری قوم کو اجتماعی طور پر غلام بنالیا اور اپنے ساتھ بابل لے گئے۔[۲۷]

سورۃ بنی اسرائیل میں یہود کی تاریخ خود ان کی مقدس کتابوں کی روشنی میں پیش کی گئی ہے۔ اللہ تعالی نے فرمایا کہ خود تمہارے صحیفوں میں درج ہے کہ تم دو مرتبہ بڑے پیمانے پر بغاوت کرو گے اور زمین میں فساد مچاؤ گے اور دونوں مرتبہ خدا سخت گیر بندے تم پر مسلط کرے گا۔

"وَقَضَيْنَآ إِلَىٰ بَنِىٓ إِسْرَٰٓءِيلَ فِى ٱلْكِتَٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِى ٱلْأَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيرًا"[۲۸]

"اور ہم نے کتاب میں بنی اسرائیل سے کہا کہ تم زمین میں دو مرتبہ فساد و بری سرکشی پھیلاؤ گے۔"

بخت نصر کے حملہ کی بابت امین احسن اصلاحی نے تدبر قرآن میں تحریر کیا ہے:

"بخت نصر اور اس کی فوجوں کے لیے عباداً لّنا اولی اپنے زور آور بندے کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں یہ ان کے دین و تقویٰ کے اعتبار سے نہیں استعمال ہوئے بلکہ صرف اس حیثیت سے استعمال ہوئے ہیں کہ انہوں نے خدا کے ارادہ کے اجرو نفاذ کے لیے آلہ و حربہ کا کام دیا۔۔۔۔۔۔ یہ اگرچہ خود گندے تھے لیکن گندگی کے ایک بہت بڑے ڈھیر کو صاف کرنے میں انہوں نے مشیتِ الٰہی کی تائید کی۔"[۲۹]

بابل میں یہودیوں کی اسیری کا زمانہ ۵۸۶ قبل سے مسیح سے ۵۳۹ قبل مسیح تک رہا یہاں تک کہ ۵۳۹ قبل مسیح میں ایران کے بادشاہ سائرس نے بابل پر قبضہ کر ڈالا اور وادی دجلہ و فرات کو ایرانی سلطنت میں شامل کر لیا۔ اس کے بعد بنی اسرائیل فارسی حکومت کی ماتحتی میں آ گئے۔ سائرس نے اگرچہ ان کو فلسطین جا کر بسنے کی اجازت تو دے دی مگر انہیں سیاسی اختیارات سے محروم رکھا جس کی وجہ سے بہت سے لوگوں نے بابل میں ہی قیام کو ترجیح دی۔[۳۰]

ورلڈ بک انسائیکلوپیڈیا میں بیان ہے:

"This was the first time since the exodus that chosen to live outside Israel."[31]

قرآن حکیم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ ٱلْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَأَمْدَدْنَٰكُم بِأَمْوَٰلٍ وَبَنِينَ وَجَعَلْنَٰكُمْ أَكْثَرَ نَفِيرًا"[۳۲]

"پھر ہم نے دوسری بار تم کو ان پر غلبہ دیا اور مال اور بیٹوں سے تمہاری مدد کی اور تم کو جماعت کثیر بنا دیا۔"

یہ غلبہ ایرانی سلطنت کے زوال اور سکندر اعظم کی فتوحات تک باقی رہا۔ ۳۲۸ قبل مسیح میں سکندر اعظم کی موت کے بعد اس کی سلطنت تقسیم ہو گئی تو فلسطین کا علاقہ بھی متحد نہ رہا۔ محققین کے مطابق سکندر کی مفتوحات میں سے شام کے علاقے پر سلوقی خاندان قابض ہو گیا جنہوں نے انطاکیہ کو اپنا پایہ تخت بنایا جب کہ مصر کے علاقے پر بطلیموسیوں کا تسلط ہوا۔ اس وقت فلسطین کا خطہ مصری حدود کا حصہ سمجھا جاتا تھا۔[۳۳]

انٹیوکس ثالث یہودیوں کا سخت دشمن تھا چنانچہ اس نے آہستہ آہستہ سیاسی اور معاشی دباؤ سے یونانی تہذیب کو یہودیت پر حاوی کرنا شروع کر دیا اور یہودیت کے وجود کو مٹانے کے درپے ہو گیا۔ ۱۶۷ قبل مسیح میں یہودیوں کے ہیکل کی سخت بے حرمتی کی گئی جس کا نتیجہ ایک ہولناک یہودی بغاوت کی صورت میں نکلا جو تاریخ میں "مکابی بغاوت" کے نام سے مشہور ہے۔ اس تحریک کو بے حد مقبولیت و کامیابی

حاصل ہوئی کیونکہ اس تحریک کے بعد ایک عارضی اور محدود یہودی ریاست قائم ہوگئی تھی جو ۶۷ق م تک قائم رہی۔ پھر آہستہ آہستہ ان کے اندر وہ اخلاقی اور دینی زور دم توڑنے لگا جو مکابی تحریک کی کامیابی کا باعث بنا تھا اس کے بجائے دنیا پرستی اور ظاہر داری نے لے لی جس کے باعث ان کا اتحاد قائم نہ رہ سکا یہاں تک کہ انہوں نے خود رومی فاتح پومپی کو فلسطین آنے کی دعوت دے دی۔[۳۴] رومی مداخلت کاروں کے فلسطین پر قابض ہونے کے کچھ ہی مدت بعد یہودیوں میں رومیوں کے خلاف نفرت اور عداوت شروع ہوگئی اور یہودیوں نے رومیوں کے خلاف عسکری مزاحمت شروع کر دی[۳۵] مگر اپنی روحانی پستی اور اخلاقی زوال کے باعث اس مرتبہ شکست ان کا مقدر ٹھہری اور ۷۰ء میں رومیوں نے یہودیوں کو بدترین شکست سے دوچار کرتے ہوئے ان کے مذہبی مرکز ہیکل کو تباہ کر دیا اور پورا یروشلم شہر برباد کر ڈالا۔ اس عظیم تباہی کے بعد یہودی مرکزیت بالکل ختم ہوگئی اور یہ پوری دنیا میں منتشر ہوگئے۔[۳۶] جب رومی حکومت نے ۳۲۵ء میں عیسائیت قبول کر لی تو یہودی عیسائیوں کے زیر عتاب آگئے اور عیسائیوں نے انہیں قاتلینِ یسوعؑ قرار دیتے ہوئے ہر ممکن تعذیب کا نشانہ بنایا۔ ساتویں صدی عیسوی میں عیسائیوں کی اکثر مقبوضات مسلمانوں کے زیر تصرف آگئیں تو یہودیوں نے سکھ کا سانس لیا اور مسلمانوں کے محکوم بن کر صدیوں تک امن و سکون سے رہتے رہے۔[۳۷]

سولہویں صدی عیسوی کے دوران سلطان سلیم اوّل نے جنگ دابق میں فتح حاصل کی تو فلسطین کا علاقہ عثمانی ترکوں کے قبضے میں آگیا اور چار سو سال یعنی بیسویں صدی تک انہی کے قبضہ میں رہا۔ بیسویں صدی میں شروع ہونے والی پہلی عالمی جنگ کے دوران سلطنتِ عثمانیہ کا جھکاؤ جرمنی کی طرف تھا لہٰذا اتحادیوں نے اس خطے میں اپنی پوزیشن بہتر کرنے کے لیے عربوں کو اپنے ساتھ شامل کرنا چاہا انہوں نے عرب لیڈروں کو یقین دہانی کروائی کہ اگر وہ بلادِ عرب میں ترکی حکومت کا تختہ الٹنے میں اتحادیوں سے تعاون کریں تو اس کے عوض یہاں ایک آزاد عرب ریاست قائم کر دی جائے گی۔ امیر مکہ شریف حسین نے اتحادیوں کا ساتھ دینے سے قبل با قائدہ شرائط طے کیں جن میں سر فہرست ایک وسیع علاقے کو عربی مملکت کی حیثیت دینا اور اسے عربوں کے حوالے کرنے کی شرط شامل تھی۔ اس حوالے سے شیخ سجاد حسین لکھتے ہیں کہ

> "یہ علاقہ شمال کی جانب ترکی میں "جرمین اور اختیہ"، جنوب میں بحر ہند، مغرب میں بحر روم اور مشرق میں خلیج بصرہ اور فارس پر مشتمل تھا۔"[۳۸]

عرب چونکہ پہلے ہی سلطنت عثمانیہ سے خائف تھے آزادی کے خوشنما خواب نے ان میں دفعتاً ایک نئی روح پھونک دی جون ۱۹۱۶ء میں انہوں نے شریف حسین کی قیادت میں ترکی کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا۔ رفتہ رفتہ بغاوت کی یہ آگ عراق، شام و فلسطین تک جا پہنچی اور چند ہی مہینوں میں یہ امر یقینی ہو گیا کہ اب ممالک عربیہ میں ترکی حکومت نہیں ٹھہر سکے گی۔ جبکہ دوسری جانب ۱۹۱۶ء میں

ہی فرانسیسی و برطانوی حکومتوں کے درمیان وہ خفیہ معائدہ طے پایا جو سائیکو پیکٹ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس معائدہ میں عثمانی علاقے فرانسیسی اور برطانوی حکومتوں کے درمیان تقسیم کر دیے

گئے۔ معاہدہ کے مطابق فلسطین کو ایک بین المملکی علاقہ قرار دیتے ہوئے اسے لیگ آف نیشن کا برطانیہ کے زیرِ انتداب حصہ بنا دیا گیا۔ عربوں کا عرب ریاست کا سہانا خواب دھرا کا دھرا رہ گیا حقیقت جو آشکار ہو کر منظرِ عام پر آئی وہ دولت عثمانیہ کا خاتمہ اور اس کے عرب علاقوں پر برطانیہ و فرانس کا تسلط تھا، ساتھ ہی ایک الگ اسرائیلی ریاست کے قیام کے لیے منصوبہ بندی جس کا باقاعدہ اظہار ۲ نومبر ۱۹۱۷ء کو برطانوی وزیر خارجہ آرتھر جے بالفور نے اعلانِ بالفور (Balfour Declaration) کی صورت میں کیا۔[۳۹] اعلان بالفور کے کچھ ہی وقت بعد ۱۱ دسمبر ۱۹۱۷ء میں برطانوی فوج جنرل Allenby کی قیادت میں بیت المقدس میں داخل ہو گئی[۴۰] ½ اور ۱۹۴۷ء تک وہاں مقیم رہی برطانوی فوجوں کے فلسطین میں داخلے کے ساتھ ہی بڑے پیمانے پر یورپ سے یہودی آبادی فلسطین منتقل کر دی گئی۔ ۳۰ جون ۱۹۲۰ء کو حکومت برطانیہ نے ایک برطانوی یہودی ہربرسیموئیل کو تشکیل حکومت کے لیے فلسطین بھیجا جس نے یہودیوں کی فلسطین نقل مکانی کے لیے بے پناہ سہولتیں فراہم کیں۔ اس متعلق لکھتے ہوئے شیخ سجاد رقم طراز ہوتے ہیں کہ

> "فلسطین پر تیس سالہ برطانوی حکومت کے دوران تقریباً چھ لاکھ یہودی فلسطین میں آکر آباد ہوئے دوسری جانب جب فلسطینیوں نے یہودیوں کو زمینیں بیچنے سے پرہیز کیا تو برطانیہ نے حکومتی زمین میں سے پچاس ہزار ایکڑ زمین یہودیوں کو دے دی۔"[۴۱]

فلسطینی زمین کا ایک بڑا حصہ خود مقامی فلسطینیوں نے مہنگے داموں یہودیوں کے ہاتھ فروخت کر دیا کیونکہ یہودیوں کی بڑی تعداد فلسطین منتقل ہونے کے باعث فلسطینی زمین کی قدر و قیمت میں بھی اضافہ ہوتا گیا اور جب عربوں کی زمین مہنگے داموں فروخت ہونے لگی تو انہوں نے بھی موقع سے فائدہ اٹھانا غنیمت جانا اور بھاری قیمت میں زمین فروخت کرتے چلے گئے۔ برطانوی دور انتداب کے پہلے نو سالوں میں فلسطین کے اندر یہودیوں کی بارہ زراعتی بستیاں قائم ہو چکی تھیں خفیہ اور اعلانیہ تقریباً ۴۶۴۰۰۰ ترکی دونام زمین خرید لی گئی تھی (ایک دونام زمین ربع ایکڑ کے برابر تھی) اور اس زمین کا ایک چوتھائی حصہ براہ راست فلسطینی جاگیرداروں اور کسانوں سے خریدا گیا تھا۔ صیہونیوں نے اس زمین کے حصول میں بے دریغ پیسہ خرچ کیا۔[42]

صیہونی تحریک کا باقاعدہ آغاز ۱۸۷۶ء میں ہو گیا تھا جب ریڈ کراس کے بانی ہنری ڈونانٹ (Henry Dounat) نے فلسطین و شام میں یہودیوں کو آباد کرنے کے لیے بین الاقوامی فلسطین سوسائٹی قائم کی جس کا مقصد یہودی قوم کے دلوں میں اپنے وطن کے حصول کی خواہش بیدار کرنا تھا۔ ان یہودی رہنماؤں کا محور و مرکز یہ نقطہ تھا کہ وہ ارض فلسطین کی روحانی میراث کے واحد وارث ہیں لہذا اس سرزمین پر صرف انہی کا حق ہے۔ اسی تاریخی وابستگی پر اصرار کرتے ہوئے انہوں نے عالمی رائے عامہ کو ہموار کرنا شروع کر دیا اور ارض فلسطین تک

رسائی کے لیے اپنی کوششیں تیز کر دیں۔ آسٹریلوی صحافی تھیوڈ ہرزل(Theode Herzel) کو عالمی صیہونی تحریک کا بانی تصور کیا جاتا ہے۔ تھیوڈ ہرزل نے ۱۸۹۶ء میں(Der Judenstaat(The State of Jews کے عنوان سے ایک کتاب لکھی جس میں پوری دنیا کے یہودیوں کے مسائل کا واحد حل ایک الگ مملکت کا قیام قرار دیا۔[۴۳] ۱۸۹۷ء میں تھیوڈ ہرزل کی رہنمائی میں پہلی یہودی کانگریس طے پائی جس میں یہودیوں کا ایک الگ مملکت کا مطالبہ اور اس کے لیے جدوجہد کا عہد کیا گیا۔ اس وقت تک فلسطین سلطنت عثمانیہ کے زیر حکومت ایک غیر ترقی یافتہ خطہ تھا جس کی بیشتر آبادی مسلم عربوں پر مشتمل تھی اور یہاں محدود تعداد میں یہودی بھی پائے جاتے تھے۔ یہیں سے عرب اسرائیل اختلافات کا آغاز ہوا جس کے متعلق مؤرخین لکھتے ہیں کہ

> *"The modern conflict between Jews and Arabs, the precursor to the Arab-Israeli conflict, began in 1881. At that time, about 565,000 Arabs and 24,000 Jews lived in Palestine; about 90% of the Arabs were Muslim while most of the rest were Christian."*[44]

صیہونی تحریک کا محور و مرکز سرزمین فلسطین میں الگ وطن کا قیام تھا۔ اس غرض کے لیے باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت کام شروع کر دیا گیا اور اگلی چند دہائیوں میں یہ تحریک یورپ اور دیگر سرمایہ دار ممالک میں پھیلتی چلی گئی۔ تحریک کے رہنماؤں نے فلسطین میں زمینیں خرید کر یہاں مہاجرین کو آباد کیا اور پوری یک جوئی سے اپنی کمیونٹی کو مضبوط کرنے کی جانب متوجہ ہو گئے۔ ۱۸۸۱ء سے ۱۹۴۸ء تک یہودیوں نے خطے میں اپنے قدم جما لیے اور انہیں عربوں پر معاشی برتری حاصل ہو گئی۔ مزید زمینیں خریدنے کے لیے یہودی قومی فنڈ میں اضافہ کر دیا گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے تل ابیب شہر یہودیوں کا مرکز بن گیا انہوں نے یہاں کئی زراعتی بستیاں قائم کر دیں۔[45]

پیل ردیف کمیشن اور ریاست اسرائیل کا قیام

صیہونی تحریک کو اہم کامیابی ۱۹۱۷ء میں بالفور ڈیکلریشن کی صورت میں حاصل ہوئی جس میں برطانوی سیکریٹری خارجہ نے یہودیوں کی الگ مملکت کے قیام کی واضح حمایت کی۔ برطانوی دور انتداب میں حکومت برطانیہ نے اپنے زیر نگرانی فلسطین میں یہودی آبادی کو ۱۹۲۲ سے ۱۹۴۴ کے دوران تراسی ہزار سات سو نوے سے بڑھا کر پانچ لاکھ اٹھائیس ہزار سات سو تک پہنچا دیا تھا۔[۴۶] ریاست اسرائیل کی تخلیق میں برطانیہ اہم معاون رہا کیونکہ برطانیہ کے اپنے کچھ مفادات اس خطے سے وابستہ تھے جن میں اہم ترین نو آبادیات ہند کا تحفظ اور شرق اوسط میں اپنے اثرات پھیلانا تھا۔ برطانیہ کی پشت پناہی حاصل ہو جانے کے بعد یہودیوں نے فلسطین میں یہودی بستیاں بسانے کی مہم تیز تر کر دی اور ان کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہونے لگا۔ عربوں کے ہاں معتبر قیادت کا فقدان پایا جاتا تھا جس کے باعث ۱۹۲۰ء تا ۱۹۳۰ء تک ان کی طرف سے اپنے مؤقف کے لیے کوئی خاص جدوجہد منظر عام پر نہیں آئی، انہوں نے جو آواز بلند کی وہ بھی محض قوم پرستی کی تحریک تک محدود تھی اس کے برخلاف یہودی نظریاتی اور سیاسی مسلک کی بنیاد پر آگے بڑھ رہے تھے لہذا ان کا گھیرا دن بدن تنگ ہوتا گیا

بالآخر عام عرب آبادی یہودیوں کی بڑھتی ہوئی تعداد سے خائف رہنے لگی نتیجتا ۱۹۲۸ء، ۱۹۲۹ء، ۱۹۳۳ء اور ۱۹۳۶ء میں عربوں اور یہودیوں کے درمیان خونریز فسادات بھی ہوئے۔ ان بغاوتوں میں صورت حال سنگین نوعیت تک پہنچ گئی اور شدید جانی اور مالی نقصان ہوا۔ معاملے کی تفتیش کے لیے پیل ردیف کی سربراہی میں ایک کمیشن فلسطین بھیجا گیا۔[۴۷]

کمیشن نے حکومت برطانیہ پر واضح کر دیا کہ چونکہ عرب و یہود دونوں کو بیک وقت خوش کرنا محال ہے لہذا فلسطین کا واحد حل اس کی تقسیم ہے یہودی پیل ردیف کمیشن سے متفق ہو گئے سوا ایک مخصوص طبقہ کے جو فلسطین کو کلی طور پر یہودیوں کی ملکیت گردانتا تھا۔[۴۸]

بڑھتے ہوئے تشدد اور یہود و عرب میں مفاہمت کی ناکامی کے بعد حکومت برطانیہ نے ۱۹۴۷ء میں فلسطینی انتداب سے دست برداری کا فیصلہ کرتے ہوئے مسئلے کو اقوام متحدہ کے حوالے کر دیا۔ اقوام متحدہ نے معاملے کی تحقیق کے لیے کمیشن فلسطین روانہ کیا جس نے فلسطین کی تقسیم کا منصوبہ پیش کیا۔ چنانچہ ۱۹۴۷ء میں یو این پارٹیشن پلان منظور کیا گیا جس کے تحت علاقے کو ایک یہودی اور ایک عرب ریاست میں تبدیل کر دیا گیا۔ علاقے کا ۵۵ فیصد یہودیوں کو جبکہ ۴۵ فیصد عربوں کو دینا منظور کیا گیا۔[۴۹]

تقسیم کے اس منصوبے کو عرب لیگ نے مسترد کر دیا، تمام عالم عرب تقسیم فلسطین کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی اور احتجاجی مظاہرے شروع کر دیئے۔ چونکہ عرب اکثریت میں تھے لہذا اکثریت کی مرضی کے خلاف فیصلہ کرنے کے لیے اقوام متحدہ کا کمیشن کا راضی نہ ہوا اس لیے ہائی کمیشن نے تقسیم کی کاروائی معطل کر ڈالی۔ دوسری جانب برطانوی ہائی کمیشن نے ۱۴ مئی ۱۹۴۸ء کو تصفیے کے کسی حل کے بغیر ہی شہر حیفہ کو خیر باد کہہ دیا اور اپنا تمام عملہ فلسطین سے واپس بلا لیا جس کے فوراً بعد ڈیوڈ بن گوریان کی جانب سے صیہونی حکومت کے قیام کا اعلان کر دیا گیا اور یوں ۱۴ مئی ۱۹۴۸ء کو تاریخ کے ۱۸۷۸ سال بعد اس زمین کے کسی ٹکڑے پر یہودیوں کی عمل داری قائم ہوئی۔[۵۰]

حوالہ جات

[۱] اکبر شاہ خان نجیب آبادی، تاریخ اسلام، (کراچی، نفیس اکیڈمی ۱۹۸۱ء)، ج ۱، ص ۷۔

[۲] باری علیگ، نظریات (لاہور، ادارہ تخلیقات، س ن) ص ۵۲۔

[۳] سلمان ندوی، تاریخ ارض القرآن (اعظم گڑھ، مطبع المعارف، ۱۴۴۲ھ) ج ۲، ص ۱۰۳۔

[۴] حبیب الحق ندوی، فلسطین اور بین الاقوامی سیاسیات، (کراچی، مشرق پریس، س ن) ص ۳۵۔

[۵] احمد حسن الزیارت، تاریخ الادب العربی، (مصر، معبصۃ الاعتماد، ۱۹۳۵ء) ص ۴۔

[۶] حفظ الرحمٰن سیوہاروی، قصص القرآن (کراچی، دارالاشاعت، س ن)، ص ۲۷۹۔

[۷] پیدائش ۳۲:۲۴-۲۵

[8] القرآن الکریم ۳:۹۳

[9]The world Encyclopedia(London: world book International) 1992, Vol XI, p 112.

[10] John D. Bengtson and Harold Crane Fleming, "In Hot Pursuit of Language in Prehistory : Essays in the Four Fields of Anthropology : In Honor of Harold Crane Fleming," 2008, 22.

[11] محمد بن جریر الطبری، جامع البیان عن تاویل القرآن، (مصر، دار المعارف، ۱۹۶۷ء)، ج ۱، ص ۲۳۳۔

[12] القرآن الکریم ۲۱:۵۲

[13] القرآن الکریم ۲۶:۷۰۔۷۱

[14] القرآن الکریم ۲۱:۲۹

[15] پیدائش ۱۲:۲

[16] حفظ الرحمٰن، قصص القرآن، ص ۳۵۳۔

[17] پیدائش ۲:۷-۸

[18] عین الحق، قدیم مشرق، (کراچی، مکتبہ فریدی، ۱۹۵۸ء)، ج ۱، ص ۳۳۷۔

[19] پیدائش ۴۷:۴۲۔۴۳

[20] ممتاز لیاقت، تاریخ بیت المقدس، (لاہور، سنگ میل پبلیکیشنز، ۱۹۷۲ء)، ص ۲۳۔

[21] پیدائش ۱۱:۴۷۔۱۲

[22] Alan B. Lloyd, *Herodotus Book II Commentary 99-182* (Brill, 1993), 76.

[23] محمد فرمان عرفان، قدیم یہودی فرقوں کی تاریخ (کراچی: ادارہ تحقیقات، ۲۰۲۱ء) ص، ۳۴-۳۳۔

[24] القرآن الکریم ۲۸ :۱۵.

[25] القرآن الکریم ۵ :۲۴.

[26] عرفان، قدیم یہودی فرقوں کی تاریخ، ص ۳۸-۳۷.

[27] محولہ بالا، ص ۴۱-۴۲

[28] اردو انسائیکلوپیڈیا، (مدیر) پروفیسر فضل الرحمٰن، (نئی دہلی: کونسل برائے ترقی اردو، ۱۹۹۶ء)، ص ۴۴۲۔

[29] امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن، (لاہور: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن، ۱۹۷۶ء)، ص ۲۵۷

[30] کتاب مقدس مطالعاتی اشاعت (لاہور: پاکستان بائبل سوسائٹی، ۲۰۱۲ء)، ص ۱۴۴۰.

[31] Encyclopedia world book, opcit, P.113

[32] القرآن الکریم ۱۷:۶

[33] عرفان، قدیم یہودی فرقوں کی تاریخ، ص ۴۸-۴۷۔

[34] John J. (John Joseph) Collins, "Jewish Cult and Hellenistic Culture : Essays on the Jewish Encounter with Hellenism and Roman Rule" (Brill, 2005), 203–4.

[35] عرفان، قدیم یہودی فرقوں کی تاریخ، ص ۳۷۵-۳۷۴۔

[36] Peter Schafer, *The History of the Jews in the Greco-Roman World* (Taylor & Francis, 2005), 129–30.

[37] ابو عبد اللہ محمد بن عمر واقدی، فتوح الشام (لاہور: ادارہ اسلامیات، ۱۹۸۶ء)، ص ۴۲۱-۴۲۰۔

[38] شیخ سجاد حسین، فلسطین و لبنان، (کراچی: آزادی قدس پبلیشرز، ۲۰۰۱ء)، ص ۲۵۔

[39] "وائس آف فلسطین"، مجلس ادارت (کراچی، ۲۰۱۸ء)، ص ۷.

[40] Anthony Bruce, *The Last Crusade: The Palestine Campaign in the First World War* (London: John Murray, 2002), 163.
[41]Encyclopedia Britannica, opcit P.83, Vol.5.
[42] Hurewitz, J.C. The Struggle for Palestine, (New York: Norton, 1950), p 32.
[43] Theodor Herzl, *The Jewish State*, trans. Sylvie D'Avigdor (New York: Courier Dover, 1988), p 40.
[44] Mark Tessler, A History of the Israeli-Palestinian Conflict (Bloomington, IN:Indiana University Press)0994 P.43
[45] "Palestine | HISTORY," accessed November 10, 2022, https://www.history.com/.amp/topics/middle-east/palestine.

[46] نصرت مرزا، چھٹی عرب اسرائیل جنگ (رابطہ پبلیکیشنز، ۲۰۰۷ء)، ص ۳۵۷.

[47] حافظ اقصی طارق، فلسطین اسرائیل تنازع اور امت مسلمہ کے کردار کا جائزہ، الادراک (لاہور: الادراک ریسرچ سینٹر، ۲۰۲۱ء)، ج ۱، شمارہ ۲، ص ۴۷-۷۳.

[48] Joseph Heller, *The United States, the Soviet Union and the Arab–Israeli Conflict,1948– 67* (Ben-Gurion Research Institute for the Study of Israel and Zionism, 2010), 9.
[49] Britannica, The Editors of Encyclopedia. "United Nations Resolution 181". Encyclopedia Britannica, 2 Nov. 2014, https://www.britannica.com/topic/United-Nations-Resolution-181. Accessed 11 November 2022.
[50] Khouri, Fred J. The Arab Israeli Dilemma, third edition (Syracuse, N.Y:Syracuse University Press)1985 p.54